علمائے کرام

اور اُن کی ذمّہ داریاں

مولانا نجم الحسن تھانوی

3080 مسروق اسلامی

NAJAFI BOOK LIBRARY

علمائے کرام

اور

اُن کی ذمّہ داریاں

ACC No. 3080 Date
Section D/107 Status
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

ACC No. Date
Section Status
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

مولانا سیّد محمّد نجم الحسن تھانوی

ACC No.
Section
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

دعوۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

NAJAFI BOOK LIBRARY
Managed by Masoomeen Welfare Trust (R)
Shop No. 11, M.L. Heights,
Mirza Kaleej Baig Road,
Soldier Bazar, Karachi-74400, Pakistan.

10

سلسلہ کتاب نمبر ۹۷

نام کتاب ——— علمائے کرام اور ان کی ذمہ داریاں

مصنف ——— مولانا نجم الحسن تھانوی

ٹائیٹل ——— سید مبین الرحمٰن

کتابت ——— جی آر انجم

پبلشر ——— دعوہ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی
اسلام آباد

طابع ——— ادارہ تحقیقات اسلامی پریس

تاریخ اشاعت جنوری ۱۹۹۰ء

NAJAFI BOOK LIBRARY
Managed by Masoomeen Welfare Trust (R)
Shop No. 11, M.L. Heights,
Mirza Kaleej Baig Road,
Soldier Bazar, Karachi-74400. Pakistan.

پیش لفظ

اسلامی معاشرہ میں علماء کرام کا کردار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ افراد کو دینی تعلیم مہیا کرنا، معاشرہ کو اسلامی خطوط پر قائم رکھنا، اجتماعی اقدار و اخلاق کی تشکیل کے عمل میں حصّہ لینا، معاشرتی برائیوں کے خلاف جہاد، معاشرہ کے با اثر طبقات کا احتساب اور محاسبہ، یہ سب علماء کرام کی وہ ذمہ داریاں ہیں جو اگر صحیح صحیح طریقہ سے ادا ہوتی رہیں تو بلاشبہ نتیجہ خیز بھی ہوتی ہیں۔ اور معاشرہ بھی اسلامی اساس پر قائم رہتا ہے۔

گذشتہ دو سو برس کی سیاسی، فکری، تہذیبی، عسکری اور معاشی غلامی کے نتیجہ میں ہمارے ہاں جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں ان کو دو چار برسوں میں دور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کام کے لئے مسلسل جہاد اور لگاتار جدوجہد کی ضرورت ہے، یہ جدوجہد انفرادی بھی ہونی چاہیئے اور اجتماعی بھی، اس میں ارباب علم و دانش، اصحاب سیاست و حکومت اساتذہ و معلمین، اہل قلم، اہل ادب، غرض سب کو حصّہ لینا چاہیئے۔

اگر یہ کہا جائے تو شاید کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ علماء کرام کا طبقہ وہ واحد طبقہ ہے جو کسی نہ کسی حد تک اپنی ملّی ذمہ داریوں کو نبھانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ لیکن شاید یہ بات

بھی غلط نہیں کہ علماء کرام کی کوششوں کے وہ نتائج نہیں نکل رہے جن کا ہر شخص منتظر ہے، جن کی ساری قوم کو توقع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حالات و زمانہ کی تبدیلی سے مسائل و مشکلات میں بھی بڑا تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ حالات و زمانہ کے تقاضوں سے واقفیت کے ساتھ ساتھ علماء کرام ان مسائل و مشکلات سے بھی آگاہی حاصل کریں جو آج ملت اسلامیہ کو درپیش ہیں۔

زیرِ نظر کتابچہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ دعوہ اکیڈمی نے علماء کرام کے مطالعہ کے لئے خصوصی تحریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس کا مقصد یہی ہے کہ علماء کرام کو تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے اصول کے تحت ان کی ذمہ داریوں کی بابت یاد دہانی بھی کرائی جائے کہ یاد دہانی اہلِ ایمان کے حق میں مفید ہوتی ہے اور ان مسائل و مشکلات کی نشاندہی بھی کی جائے جو دعوت و تبلیغ کے راستہ میں درپیش ہیں۔

دعوہ اکیڈمی مولانا سید نجم الحسن صاحب کی شکر گزار ہے کہ انہوں نے ہماری درخواست پر یہ کتابچہ تحریر فرمایا اور اکیڈمی کو اس کی طباعت کی اجازت دی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہمارے اور اس کے محترم قارئین کے لئے مفید بنائیں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی
ڈائریکٹر جنرل
دعوہ اکیڈمی

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No 11,
M . Heights
Mirza Kaleej
Baig Road,
Soldier Bazar
Karachi.
MASUMEEN WELFARE TRUST (R)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

علمائے کرام اور اُن کی ذمہ داریاں

تمہید

زیرِ نظر مضمون کی تحریر کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے علمائے کرام کو، اُن باتوں کی طرف متوجہ کیا جائے جو نظروں سے اُوجھل ہو رہی ہیں یا ان کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج بفضلہ تعالیٰ پاکستان میں علمائے کرام کی کمی نہیں۔ پاکستان بننے سے قبل کے زمانے پر نظر ڈالی جائے تو صورتِ حال آج سے بہت مختلف تھی۔ یعنی بڑے بڑے مدارس، اس سرزمین میں تھے جو اب "بھارت" کہلاتا ہے۔ اور ان بڑے مدارس میں ہر سال فارغ ہونے والوں کی تعداد چالیس پچاس افراد فی مدرسہ سے زائد نہیں تھی۔ لیکن آج ماشاءاللہ سرزمینِ پاکستان میں مدارس دینیہ کا جال بچھا ہوا ہے اور بڑے مدارس کے فارغ ہونے والوں کی تعداد کم از کم ایک سو افراد فی مدرسہ کے لگ بھگ ہے۔ اور محتاط اندازے کے مطابق ہر سال بفضلہ تعالیٰ ہزاروں طلباء کی دستار بندی ہو کر علماء کی تعداد میں زبردست

اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ صورتِ حال ایک طرف اگر حوصلہ افزا ہے کہ بحمداللہ مسلمانوں میں علمِ دین کے حصول کا ذوق و شوق بڑھ رہا ہے اور ملک میں علمائے دین کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو کر ملت کی دینی ضرورتوں کے پورا ہونے کی اُمید کو تقویت مل رہی ہے۔ تو دوسری طرف حوصلہ شکن بھی ہے کہ قوم و ملت کے افراد میں دینی شعور، دینی رجحان، دینی جذبہ اور دین پر عمل روز بروز زوال پذیر ہے۔ آج سے پچاس سال قبل کے زمانے کو دیکھا جائے تو باوجود علماء کرام کی تعداد کم ہونے کے، صورتِ حال مختلف تھی، خواص تو خواص، عوام میں بھی دینی معلومات ضروری حد تک موجود تھیں۔ روزمرہ کی عبادات کے متعلق مسائل و فضائل، ہر وقت کی خرید و فروخت کے متعلق دینی معلومات، اخلاق و عادات کو سنوارنے کی طرف توجہ، عام اخلاقی و دینی تعلیم کا گھر گھر چرچا، اور آپس کی نشست و برخاست، بول چال اور برتاؤ میں دین کے تقاضوں کا لحاظ، مسلمانوں میں عام تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ علماء کرام کی تعلیم اور ان کی کوششوں ہی کے ثمرات تھے کہ جن کی وجہ سے مسلمانوں کا معاشرہ بڑی حد تک اسلامی معاشرہ تھا۔

آج حالت بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ علمائے کرام اور قوم کے دیگر طبقوں سے تعلق رکھنے والے خصوصاً نو تعلیم یافتہ حضرات، مسلسل ایک دوسرے سے دُور ہوتے چلے جا رہے ہیں اور یہ خلیج روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ صورتحال تشویشناک ہے اور اس کا ختم ہونا بہت ضروری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ علماء سے مستغنی ہیں یا یہ کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی ان کو دین سیکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس صورتِ حال کو درست کرنے کے لئے ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم بجائے علماء کرام کے، عوام سے خطاب کرتے۔ مگر ہمیں علماء کرام کے طبقے سے اس سلسلے میں جو اُمیدیں وابستہ ہیں، وہ کسی اور سے نہیں۔ ہمیں اُمید واثق ہے کہ علماء کرام، جس سنجیدگی اور متانت و دلسوزی کے ساتھ ہماری معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور فرما کر سرگرم عمل ہوں گے اور اُس کے انشاءاللہ جو بہتر ثمرات مرتب ہوں گے، وہ دوسری کسی صورت میں نہیں ہوں گے۔ پھر یہ بھی

بات ہے کہ علمائے کرام کا طبقہ چونکہ ایک ہی قسم کے علم و عمل سے آراستہ ہے جس کا مقصد ہی اصلاح خلق و رضائے خداوندی ہے اور ان حضرات کی زندگی کا مطمح نظر ہر قسم کی تکلیفیں اٹھا کر دین کا بول بالا کرنا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ علمائے کرام کی تعداد بھی عوام کے مقابلے میں بہت کم ہے، اس لئے ان تک بات پہنچانا سہل ہے۔ بخلاف عوام کے، کہ ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور ان میں کوئی چیز ایسی نہیں، جس پر سب مجتمع ہوں۔ بلکہ ہر طبقے کے رجحانات اور تقاضے مختلف ہیں۔ ان وجوہ اور دیگر کئی وجوہ کی بناء پر ہم علماء کرام کی خدمت میں کچھ معروضات پیش کرنے چلے ہیں۔ آپ حضرات سے درخواست ہے کہ خالی الذہن ہو کر ان پر غور فرمائیں اور قوم کی دینی حالت سدھارنے کے لئے حسب استطاعت آگے بڑھیں۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی مخلصانہ مساعی کی برکت سے اس کٹھن کام کو آسان فرمادے گا۔

یہ بھی خیال گذرتا ہے کہ ہمارا یہ اقدام "سورج کو چراغ دکھانے" یا "لقمان کو حکمت سکھانے" کے مترادف نہ ہو۔ کیوں کہ جو معروضات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں، وہ آپ جیسے اصحاب علم و فضل سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن مقصد صرف یہ ہے کہ ایک بار ان امور کی یاد دہانی کرادی جائے جن کی طرف سے کسی وجہ سے ذہول ہو رہا ہے۔ واللہ الموفق والمعین۔

مُسلم معاشرہ میں علماؑ کا مقام

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ آج کے گئے گذرے دور میں بھی ہمارے معاشرہ میں علماء کرام کا جو مقام ہے وہ اتنا اُونچا ہے کہ ملک و ملت کا کوئی بھی طبقہ ہو، اس کے ذہن میں دینی لحاظ سے صرف علمائے کرام کی بات اور ان کی رائے کا وزن ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشرہ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں کہ وہ علماء کرام کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرنے میں کمزوری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر جہاں تک اُن کی بات کا تعلق ہے، ان کا ضمیر اسی کو صحیح جانتا ہے جو علماء کرام کہتے ہیں۔

اس کے پیشِ نظر، ظاہر ہے کہ علماء کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے اور علماء کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ قوم کی صحیح راہنمائی کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہیں اور ہر شخص اور ہر طبقے کو، اس کی سمجھ اور فہم کے مطابق بات کو سمجھانے کی کوشش کریں۔

دوسری طرف یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ جب سے برِصغیر پاک و ہند پر انگریز نے غاصبانہ قبضہ کیا، تبھی سے اس نے یہ محسوس کر لیا کہ اس ملک میں اولاً تو مسلمانوں کا اثر و رسوخ اور طاقت بہت زیادہ ہے اور ثانیاً مسلمانوں میں علماء کی جماعت بہت زیادہ اثر انداز ہے کہ مسلمان، ان کے کہے پر بے چون وچرا عمل کرتے ہیں۔ ان باتوں کے پیشِ نظر انگریز نے اس سرزمین میں بسنے والی تمام قوموں سے صرفِ نظر کر کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ

اپنے جور وظلم کا نشانہ بنایا۔ ان میں بھی علمائے کرام کو خاص طور پر ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں ۔ چنانچہ تاریخ اس امر کی امین ہے کہ انہوں نے عام مسلمانوں پر جو مظالم کئے اور جو سزائیں ان کو دیں، وہ ایسی وحشیانہ اور سفاکانہ تھیں کہ تاریخ میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے خاص کر علماء (جو اُس وقت بہت بڑی تعداد میں اس سرزمین میں موجود تھے) کو اپنی درندگی کا خاص طور پر نشانہ بنایا۔ چنانچہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں علماء کو پکڑ کر، اولاً ان سے یہ کہلوانے کی کوشش کی جاتی کہ ہم انگریزوں کا ساتھ دیں گے اور بغاوت و سرکشی سے تائب ہوتے ہیں، مسلمانوں کو بھی یہی راہ دکھائیں گے۔ وغیرہ۔ جب تمام تر تشدد کے باوجود، وہ حضرات اس کے لئے آمادہ نہ ہوتے تو ان کے جسم کو توپ کے دہانے سے باندھ دیا جاتا اور کہا جاتا کہ اگر نہیں مانتے تو تم کو توپ سے اڑا دیا جائے گا۔ مگر الحمدللہ علماء کرام نے اُن کی اطاعت قبول نہ کی۔ اور اُن سفاک درندوں نے اُن حضرات کو توپ کے مُنہ سے باندھ کر توپ چلا دی جس سے اُن حضرات نے اس طرح جامِ شہادت نوش کیا کہ ان کے جسم کے چیتھڑے اور ہڈیاں فضا میں بکھر گئیں۔ (ایسا عمل اُن لوگوں نے دوسرے مذاہب کے راہنماؤں کے ساتھ نہیں کیا)۔ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد بھی انہوں نے یہ محسوس کیا کہ نہ علماء کا اثر و رسوخ کم ہوا ہے نہ مسلمانوں کی طاقت کمزور ہوئی۔ بلکہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریز کی طرف سے نفرت اور اشتعال بڑھتا جا رہا ہے۔ تو ان لوگوں نے طویل المیعاد منصوبے بنانے شروع کئے۔ جن میں سرِ فہرست دو باتیں تھیں۔ ایک تو نئی نسل کو ذہنی طور پر گمراہ کرنا کہ اُن کے دِلوں سے دین اور دینداروں کی عظمت و وقعت و ضرورت نہ صرف کم ہو جائے بلکہ رفتہ رفتہ وہ ان چیزوں سے بے زار ہو جائیں۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے جو طریقے اختیار کئے اور جو حربے بروئے کار لائے۔ ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں، کیوں کہ وہ ایک مستقل اور المناک داستان ہے۔ مگر اس وقت یہ بتانا ہے کہ وہ اپنے ان مذموم عزائم میں اس حد تک ضرور کامیاب ہو گئے اس ملک میں ایک با اثر ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو نہ صرف انگریز اور انگریزیت کو پسند کرنے لگا، بلکہ

اس کو ایک سازش کے تحت یہ بھی ذہن نشین کرا دیا گیا کہ مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ علمائے دین ہیں۔ اس طرح اس طبقے کے دل میں علماء کی طرف سے نفرت و حقارت کا بیج بو دیا گیا۔ علماء کے باہمی اختلاف کو خوب اُچھالا گیا۔ ایسے لوگ پیدا کئے گئے کہ جنہوں نے بھیس بدل کر اُن کے ایجنٹوں کا کام کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج عوام و خواص میں علماء کے خلاف جس چیز کا چرچا ہے وُہ یہی ہے کہ "علماء میں اختلاف ہے۔ ہم کدھر جائیں۔" ہر سادہ لوح انسان کو اس بات سے متاثر کر لیا جاتا ہے۔ علماء کو معاشرہ میں ایک اجنبی کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا ہے اور بجز اذان دینے نماز پڑھانے، جنازہ و نکاح پڑھانے وغیرہ کے فرائض جو ایک عالم کے ذمے سمجھے جانے لگے۔ باقی تمام امور سے ان کو الگ کر دیا گیا۔ علماء پر سے ہر قسم کا اعتماد اٹھانے کی بھرپور کوشش ہو رہی ہے۔

یہ صورتِ حال انتہائی خطرناک اور بھیانک ہے۔ کیونکہ اگر علماء پر سے عوام و خواص کا اعتماد اُٹھ گیا تو پھر دین کا خدا حافظ ہے۔ جیسے کسی قوم کو "مستند ڈاکٹروں" سے بدظن کر کے یہ سمجھا دیا جائے کہ یہ لوگ اعتماد کے قابل نہیں تو پھر قوم عطائیوں اور پنساریوں کی طرف رجوع کرنا شروع کر دے گی اور پھر اس کی صحت کے تباہ ہونے میں کیا کلام ہے۔

علماؔ کے اختلاف کی حقیقت

اس جگہ یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ علماء میں اختلاف کی کیا حقیقت ہے اور اس کو ایک سازش کے تحت کس انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

اوّل تو یہ غور کیجئے کہ اس دنیا میں کون سا شعبہ ہے اور کون سا طبقہ ہے جس میں اختلاف نہیں۔ تجارت۔ زراعت۔ علاج معالجہ۔ علوم وفنون۔ سائنس۔ صحافت۔ ادب۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ صنعت وحرفت۔ غرض کس جگہ اختلاف نہیں۔ اختلاف ہی سے دُنیا قائم ہے۔ مگر کیا ہر شعبے کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا جائے گا کہ اس میں اختلاف ہے اور پھر اس شعبے کے ماہرین کو چھوڑ کر جہلا اور ناواقفوں کا اتباع کیا جائے گا۔ بلڈنگیں اور مکانات تعمیر کرنے چھوڑ دو کہ انجنیئروں میں اختلاف ہے۔ کھیتی باڑی ترک کر دو کہ اس میں اختلاف ہے۔ بیماریوں کا علاج کرنا چھوڑ دو کہ اس میں اختلاف ہے۔ وغیرہ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کسی چیز کو نہ چھوڑا گیا نہ اس کے جاننے والوں پر اختلاف کی وجہ سے عدمِ اعتماد کا اظہار کیا گیا۔ بلکہ ہر کام جاری ہے اور ہر شخص اپنی اپنی پسند کے ماہر کے پاس جا کر اپنا کام کراتا ہے۔ کسی اناڑی، ناواقف اور متعلقہ فن سے جاہل کی طرف ہرگز رجوع نہیں کرتا۔ تو ہماری گذارش یہ ہے کہ دین کے بارے میں بھی یہی طریقہ اختیار کیجئے۔

دوسری بات غور کرنے سے یہ واضح ہوتی ہے کہ علماء کا اختلاف تو صرف چند مسائل میں ہے۔ ہزارہا باتوں میں سب کا اتفاق ہے۔ مثلاً جھوٹ بولنا۔ غیبت کرنا۔ ملاوٹ کرنا۔ جھگڑا فساد پھیلانا۔ گالی گلوچ کرنا۔ حسد کرنا۔ تکبر کرنا۔ ظلم کرنا۔ قتل کرنا۔ چوری کرنا۔ ڈکیتی کرنا۔ کہاں تک

گنوایئے۔ ان سب چیزوں کو کون سا عالم ہے جو درست اور ٹھیک کہتا ہو۔ سب علماً باتفاقِ رائے ان کو بُرا کہنے اور ان کا ارتکاب کرنے سے رُکتے ہیں۔ دوسری طرف نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا۔ حج کرنا۔ سچ بولنا۔ امانت و دیانت اختیار کرنا۔ محبت و ہمدردی کرنا۔ خدا سے ڈرنا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرنا۔ تواضع۔ حِلم و بردباری۔ متانت و سنجیدگی، صبر، شکر، قناعت، فکرِ آخرت۔ وغیرہ۔ کون سا بدبخت عالم ہے کہ وہ ان چیزوں کو چھوڑنے کو کہتا ہے۔ سب علماء باتفاقِ رائے ان چیزوں کو اچھا کہتے اور ہر شخص کو ان باتوں کے کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر، ہم اگر یہ دیکھتے کہ جن چیزوں میں علماء کا اتفاق ہے، وہ تو ساری کی ساری قوم نے اپنا رکھی ہیں اور دل و جان سے اس پر عمل کر رہے ہیں۔ مگر چند وہ باتیں کہ جن میں اختلاف ہے، اس میں پریشان ہیں کہ کیا کریں۔ تو ہم سمجھتے کہ وہ اس کہنے میں حق بجانب ہیں کہ علماء میں اختلاف کی وجہ سے فلاں فلاں باتوں پر عمل کرنے میں دشواری ہو رہی ہے۔ مگر اس کا حل بھی پہلی بات سے نکل آتا ہے کہ جس کے ساتھ آپ کو زیادہ اعتقاد ہو، اس کی بات مان لو، جیسے ڈاکٹروں میں کرتے ہو۔ مگر حالت یہ ہے کہ نماز، جو سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ اتفاق والی چیز ہے کہ سب اس کے پڑھنے کو کہتے ہیں۔ اس میں ہمارا کردار یہ ہے کہ مسجدیں خالی پڑی ہیں۔ جس مسجد میں ایک سو نمازیوں کی جگہ ہے وہاں آٹھ دس ہوتے ہیں۔ ورنہ اگر سب نمازی بن جائیں تو موجودہ مسجدیں ناکافی ہو جائیں۔

واضح ہو گیا کہ علماء کے اختلاف کا پروپیگنڈا صرف دین کے کاموں سے راہِ فرار اختیار کرنے کے لئے ہے۔ اور نفس و شیطان کی ایک چال ہے جس سے ہم دین سے متنفر ہو رہے ہیں جس میں سراسر ہمارا نقصان ہے۔

غرض کہنا یہ ہے کہ علماء کا مقام معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کا سا ہے۔ جب تک قوم ان سے دُور رہے گی، اپنا ہی نقصان کرے گی۔

علم کس کو کہتے ہیں

علماء اور عوام و خواص کو اپنے اپنے فرائض جان لینے کے بعد یہ جاننا چاہیئے کہ "علم کیا ہے۔"

اگرچہ علماء نے اس کی تعریفیں مختلف انداز میں کی ہیں اور اس کے معنی سمجھانے کے لئے مختلف انداز اختیار کئے ہیں، مگر اس کے لئے مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ "علم" کے معنی "جاننا" اس طرح ہر چیز جس کے بارے میں ہم نہیں جانتے تھے، ہم اس کو جان لیں گے تو ہمیں اُس چیز کا علم حاصل ہو جائے گا۔

لیکن شریعت کی اصطلاح میں جب علم کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد دین کا علم ہوتا ہے۔ یعنی دین کی باتوں کو جاننا۔ اور اصطلاحِ شریعت میں وہی علم معتبر ہے جس پر عمل بھی کیا جائے۔ دین کا علم حاصل کرنے کے بعد اگر اس کے مقتضا پر عمل نہ کیا گیا تو وہ "علم" بے کار ہے اور جہالت سے بدتر ہے۔ قرآنِ مجید میں ایک جگہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا ذکر ہے کہ

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ — اور بے شک علم حاصل کر لیا اُنہوں نے

مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ — اس بات کا کہ بے شک جس نے اُس

خَلَاقٍ ۝ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (پ۱ ع ۱۲)

(جادو) کو حاصل کیا ایسے شخص کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔ اور بے شک بہت بُری ہے وہ چیز جس میں وہ اپنی جان دے رہے ہیں۔ کاش کہ وہ علم رکھتے۔

اس آیت میں غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ کلام کی ابتدار" وَلَقَدْ عَلِمُوْا " سے ہو رہی ہے جس میں تاکید کے ساتھ علم کو ثابت کیا جا رہا ہے اور کلام کا اختتام "لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" پر ہو رہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو علم نہیں تھا۔ کیوں کہ تمنا اسی چیز کی کی جاتی ہے کہ جو معدوم ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف لغوی طور پر علم حاصل کرنا معتبر نہیں جب تک کہ اس پر عمل نہ ہو۔ اگر ایک شخص کو یہ معلوم ہے کہ سنکھیا کھانے سے انسان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ سنکھیا کھا کر مر جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا یہ علم بے کار ہوا۔ اسی طرح دین کی باتوں کو جاننے کے باوجود ان پر عمل نہ کرنا، علم نہیں کہلاتا۔ اسی طرح علمِ دنیا کو علم نہیں کہتے بلکہ وہ فنون اور صنائع کہے جاتے ہیں جیسے سائنس۔ ریاضی وغیرہ علوم نہیں، فنون ہیں ؎

فلسفہ یا نحو یا طب یا نجوم
ہندسہ یا رمل یا اعدادِ شوم
علمِ رسمی سر بسر قیل ست و قال
نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

علمِ حقیقی کی نشاندہی فرماتے ہیں ؎

جانِ جملہ علمہا این ست و ایں
کہ بدانی من کیم در یومِ دیں

مطلب یہ کہ علم تو وہی ہے جس کے بعد انسان کو فکرِ آخرت لگ جائے۔

علم کی اقسام

اُوپر کی تفصیل سے علم کی اقسام خود بخود معلوم ہو گئیں جو اصطلاح میں "علمِ معاش" اور "علمِ معاد" کہلاتا ہے۔ یعنی جو علم انسان دنیا کمانے یا دنیا کی معلومات جمع کرنے کے لئے حاصل کرتا ہے وہ علم معاش کہلاتا ہے۔ اور جو علم دین حاصل کرنے اور اپنی آخرت سنوارنے کے لئے حاصل کر کے اس پر عمل کرنا شروع کر دے، وہ علم معاد کہلاتا ہے۔ اِس وقت ہمارا روئے سخن ان حضرات کی طرف ہے جو عالمِ دین ہیں اور علمِ معاد کے حامل ہیں۔

علمِ دین کی فضیلت

علمِ دین کی اہمیت واضح کرنے کے لئے اس جگہ مختصر طور پر علم دین کے کچھ فضائل بیان کئے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ حاملانِ علومِ دینیہ خدا کے فضل سے کس اونچے مقام پر فائز ہیں۔ اور خدا اور رسول کی نظر میں ان کی کیا قدر و قیمت ہے۔

ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

کیا برابر ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو علم نہیں رکھتے۔

دوسری جگہ فرمایا

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

اللہ تعالیٰ بلند فرماتا ہے ان لوگوں کو جو ایمان لائے تم میں سے اور ان لوگوں کے جو علم والے ہیں بہت درجے (بلند فرماتا ہے)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

ان العالم لیستغفر لہ من فی السمٰوٰت و من فی الارض حتی الحیتان فی الماء

بے شک عالم کے لئے استغفار کرتے ہیں جو بھی زمین اور آسمانوں میں ہیں حتیٰ کہ مچھلیاں پانی میں۔

اور فرمایا

فضل العالم علی العابد کفضل القمر علی سائر الکواکب

عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسی چاند کی تمام ستاروں پر۔

نیز فرمایا

ان العلماء ورثۃ الانبیاء والانبیاء ماورثوا درھما ولا دینارا وانما ورثوا العلم، فمن اخذ بہ اخذ بحظ وافر من میراثھم۔

بے شک علماء انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں۔ اور انبیاء ورثہ میں دینار و درہم نہیں چھوڑتے بلکہ علم کی میراث چھوڑتے ہیں تو جس نے علم کو حاصل کیا اس نے ان کی میراث سے بڑا حصہ پایا۔

ان آیات و احادیث سے علم اور عالم کی فضیلت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت آیات و احادیث موجود ہیں۔ جن سے علم کی رفعتِ شان اور علماء کا بلند مقام معلوم ہوتا ہے۔

اوپر اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ اصطلاح شریعت میں علمِ دین ہی کو علم کہا جاتا ہے جس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ علمِ دین کے حامل ہی کو "عالم" کہا جاتا ہے۔ مگر اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں عالم کون ہے؟ اس کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

عالم کی تعریف

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مستند دینی مدرسے میں تعلیم حاصل کر کے سند حاصل کرلے تو وہ عالم بن جاتا ہے اور ایسے حضرات جو یہ سند حاصل کر لیتے ہیں، خود بھی اپنے کو عالم و فاضل ہی سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن صورتِ حال ایسی نہیں۔ بلکہ علم حاصل کرنے کے بعد ضرورت ہے اس بات کی کہ علم پڑھانے اور دوسروں کو پہنچانے میں بھی معتد بہ وقت اساتذہ کی نگرانی میں لگایا جائے۔ کیوں کہ تعلیم سے فراغت اور سند حاصل کرنے کے بعد انسان میں علمی استعداد تو پیدا ہو جاتی ہے مگر علمی استعداد کو بڑھانے اور کار آمد بنانے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اساتذہ کرام اور ماہرین کی نگرانی میں تدریس کا کام کیا جائے۔ جتنا عرصہ علم حاصل کرنے اور پڑھنے میں صرف ہوا ہے، کم از کم اُتنا ہی عرصہ پڑھانے میں لگایا جائے تب کہیں جا کر استعداد پختہ ہوتی ہے اور ایک فارغ التحصیل طالب علم کو عالم کہا جا سکتا ہے۔

لیکن یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ اس کائنات میں ہر چیز کی ایک صورت ہے، ایک حقیقت ہے۔ اور اگرچہ صورت بغیر حقیقت کے پائی تو جا سکتی ہے مگر وہ بغیر حقیقت کے بے کار ہے۔ اور حقیقت بغیر صورت کے پائی ہی نہیں جا سکتی۔

لئے ملا کہ جو اندھا بھی ہے۔ بہرا بھی ہے۔ گونگا بھی ہے۔ مفلوج بھی ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں شل ہیں۔ تو یہ شخص صورتِ انسان تو ہے مگر انسان کی حقیقت اس میں موجود نہیں اور ملازم آپ اسی کو رکھیں گے جس میں حقیقتِ انسان بھی موجود ہو۔ مگر حقیقتِ انسان، آپ کو بغیر صورتِ انسان کے، کسی طرح بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ غرض اس کائنات میں صرف صورت سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ صورت کے ساتھ حقیقت بھی ہے یا نہیں۔ مثلاً ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے۔ آپ اس کو دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ یہ شخص نماز پڑھ رہا ہے۔ لیکن اگر وہ بے وضو ہو۔ یا سورۃ وغیرہ نہ پڑھ رہا ہو، صرف رکوع سجدہ وغیرہ

کر رہا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ واقع میں اور حقیقت میں نماز نہیں پڑھ رہا۔

اب یہ سمجھئے کہ اُوپر کی تفصیل سے جو کچھ معلوم ہوا کہ ایک طالب علم ایک مناسب عرصے تک فراغت کے بعد پڑھانے کا کام کرے گا تو عالم کہلانے کا مستحق ہوگا۔ تو یہ سب کچھ کرنے سے "صورتِ علم" اس طالب علم کو حاصل ہو گئی مگر "حقیقتِ علم" ابھی حاصل نہیں ہوئی بلکہ اس کے لئے اور کچھ تقاضے بھی ہیں جن کا ہونا ضروری ہے۔

ان امور کو سمجھنے کے لئے قرآنِ مجید کی آیت کے ایک ٹکڑے میں غور کیجئے۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا	اللہ تعالیٰ سے تو صرف علماء ہی ڈرتے ہیں۔

اس جگہ کلام میں حصر ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ سے ڈرنے والے اگر کوئی ہیں، تو وہ صرف علماء ہیں۔ علماء کے سوا اللہ سے کوئی نہیں ڈرتا۔ یہاں سے یہ ثابت ہو گیا کہ علماء کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔ ظاہر میں بھی باطن میں بھی۔ یہ ہے وہ "حقیقت"۔ جو صورت کے ساتھ ہونی ضروری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کی بارگاہ میں عالم تبھی کہلائے گا، جب اس کے دل میں اللہ کا خوف بھی ہو۔ صرف کتابیں پڑھ لینے سے اپنے کو عالم سمجھنا غلطی ہے۔

خشیتِ خداوندی کے درجات

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ خدا تعالیٰ کا خوف، تو ایسی چیز ہے کہ ہر مسلمان کے دل میں ضرور ہوتا ہے۔ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی اس سے خالی نہیں۔ تو کیا اس طرح، تمام مسلمان (خواہ وہ کسی درجے کے ہوں) علماء میں شامل ہو جائیں گے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ سو اس کو سمجھنے کے لئے یہ سمجھئے کہ خشیتِ خداوندی کے درجات ہیں۔ ادنیٰ درجے کی خشیت تو ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ مگر خشیت کے اعلیٰ، ارفع، اعلیٰ تر، ارفع تر، اعلیٰ ترین

اور ارفع ترین درجات ہر شخص کو حاصل نہیں ہیں۔

خشیتِ خداوندی کے اثرات

ایک ضروری بات یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف کی کیفیت اگر انسان پہ بہت زیادہ طاری ہو جائے تو وہ باطنی طور پہ مضر ہوتی ہے۔ کیونکہ خشیت کی زیادتی سے انسان بعض اوقات معطل ہو کے رہ جاتا ہے۔ نہ دنیا کے کام کا رہتا ہے اور نہ دین کے۔ بخلاف "محبت" کے، کہ اس کی شان یہ ہے کہ جتنی بھی ہو، مفید ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب خشیت کے حصول کے لئے دعا تعلیم فرمائی تو خشیت کو محدود کر دیا اور فرمایا کہ

اللّٰھم انّی اسئلک مخافۃ تحجزنی عن معاصیک	یا اللہ میں تجھ سے تیرا خوف اتنا مانگتا ہوں کہ جو مجھے تیری نافرمانی سے باز رکھے۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ خوف خدا کی تاثیر یہ ہے کہ انسان اللہ کی نافرمانی سے بچنے لگتا ہے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ خوف صرف اتنا مطلوب ہے کہ جس سے انسان گناہوں سے بچنے لگے۔

دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ

اللّٰھم انّی اسئلک حبّک وحبّ من یحبک وحب عمل یقرب الی حبّک	یا اللہ میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں اور ان لوگوں کی محبت مانگتا ہوں جن کو تجھ سے محبت ہے اور اس عمل

کی محبت مانگتا ہوں جو تیری محبت سے قریب
کر دے۔

دیکھئے محبت کے سلسلے میں محبت کو محدود کر کے طلب نہیں فرمایا۔ وجہ ظاہر ہے کہ محبت جتنی بھی ہو گی، وہ معین ہو گی اعمال میں اور قرب میں۔ بخلاف خوف کے کہ وہ اگر حد سے زائد ہو تو مضر ہو جاتا ہے۔ سبحان اللہ! کیا تعلیم ہے۔

نتیجہ

اس تفصیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ عالم وہ ہے کہ جو اللہ سے ڈرتا ہو۔ اللہ سے ڈرنے والا وہ ہے کہ جو گناہوں سے بچتا ہو۔ یہ گویا منطقی اصطلاح میں "صغریٰ کبریٰ" ہو گیا۔ اب "شکلِ اوّل" (جو منطق کی چاروں شکلوں میں سب سے زیادہ بدیہ الانتاج ہے) سے نتیجہ نکال لیجئے جس کی تفصیل یہ ہے کہ

العالم یخشی اللہ، و من یخشی اللہ یحجر عن المعاصی، فالعالم یحجر عن المعاصی

یعنی عالم وہ ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ اور ہر وہ شخص جو خدا سے ڈرتا ہے گناہوں سے بچتا ہے۔ لہٰذا عالم گناہوں سے بچتا ہے۔

حاصلِ کلام

اس تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ خدا تعالیٰ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ

عالم وہی ہے جو گناہوں سے بچتا ہو۔

گویا ہر شخص کے ہاتھ میں معیار آ گیا کہ وہ اپنے کو جانچ لے کہ عالم ہوں یا نہیں۔ گناہ کے لفظ کو عام رکھا جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے گناہ۔ ظاہری، باطنی، صغیرہ، کبیرہ،

یہ بات واضح ہوگئی کہ عالم بننے کے لئے جہاں کتابی علم ضروری ہے۔ وہاں صفاتے باطن بھی ضروری ہے کیوں کہ خشیتِ خداوندی اور اجتناب عن المعاصی صفائے باطن اور تزکیۂ نفس کے بغیر ممکن نہیں۔

تزکیۂ نفس کی ضرورت

جیسا کہ معلوم ہے کہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا سبب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نیکی اور بدی اختیار کرنے کی طاقت عطا فرمائی ہے۔ یعنی کوئی شخص اگر نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے تو وہ کسی کے جبر سے نہیں کرتا بلکہ اپنی رائے، اپنی پسند اور اپنے عزم و ارادہ سے کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص برائی کا راستہ اپناتا ہے، وہ بھی اپنے اختیار اور پسند سے اپناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی نجات اور کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نیکی کا راستہ اختیار کرے لیکن جب وہ ایسا کرتا ہے تو اس کو بہت سی مشکلات اور رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ سب سے پہلے تو انسان کا نفس آڑے آجاتا ہے جو برائی کا اور آزادی کا طالب ہے۔ شریعت کی پابندی کرنے میں انسان کی آزادی پر زد پڑتی ہے اس لئے فطری طور پر انسان کو نیکی کی راہ اختیار کرنے میں مشقت پیش آتی ہے۔ اگر زبردستی کسی نے نیکی کی راہ اختیار کر بھی لی اور اپنے نفس پر جبر کر کے صحیح راہ پر گامزن ہو بھی گیا تو ہر وقت نفس کے ساتھ کشاکش اور مقابلے کی صورت رہتی ہے۔ مثلاً نماز پڑھنی شروع کی ہے تو دو چار دن تو پابندی ہو جاتی ہے مگر پھر نفس غالب آجاتا ہے اور نماز چھوٹ جاتی ہے۔ پھر کچھ روز کے بعد نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے تو پھر نماز پڑھنی شروع کر دیتا ہے مگر پھر کچھ روز کے بعد رہ جاتا ہے۔ دوسری عبادات و اعمال کا بھی یہی ہوتا ہے۔ اس لئے اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے ضرورت ہوتی ہے اس امر کی کہ مستقل طور پر انسان اپنے نفس پر غلبہ پالے تاکہ نفس کی مخالفت کے وقت اس پر قابو پالیا جائے اور اعمالِ صالحہ اور راہِ نیک پر چلنے میں خلل نہ پڑے۔ اس مقصد کے لئے

ضروری ہے کہ کسی مرشدِ کامل سے تعلق پیدا کیا جائے اور اس کی ہدایات و تربیت پر عمل کر کے، کچھ ریاضتیں اور مجاہدے کئے جائیں۔ تب انشاء اللہ نفس بھی مغلوب ہو جائے گا اور اعمالِ صالحہ میں بھی خلل نہ پڑے گا۔ جس کی برکت سے قلب و روح "خشیتِ خداوندی" کی دولت سے آراستہ ہو جائیں گے اور انشاءاللہ گناہوں سے بے رغبتی بلکہ نفرت پیدا ہو جائے گی۔ اگر بشریت سے کبھی کوئی گناہ ہو بھی گیا تو فوراً توبہ کی توفیق ہو جائے گی۔ اس طرح انسان کی زندگی درست ہو جائے گی اور انسان صحیح معنوں میں عالم کہلانے کا مستحق ہو جائے گا۔

چونکہ ہمارا خطاب اِس وقت انہی حضرات سے ہے جو دینی لحاظ سے عالم ہیں اور بفضلہ تعالیٰ علمِ دین کے زیور سے آراستہ ہیں، اس لئے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان حضرات کی ذمہ داریاں اور فرائض کیا ہیں؟

علمائے کرام کی ذمہ داریاں اور ان کے فرائض

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے

العلماء ورثۃ الانبیاء

علماءِ (دین) انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں۔

اس لئے وہ تمام فرائض اور ذمہ داریاں جو اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام علیہم السلام کو دے کر اس کائنات میں بھیجا۔ علمائے کرام پر بھی عائد ہوتی ہیں۔ اب چونکہ نبوت ختم ہو گئی مگر نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار، تعلیمات و اسوہ اور آپ کی لائی ہوئی کتاب اور شریعت اور آپ کی سنتِ مقدسہ سب کچھ اپنی اصلی صورت میں موجود ہیں اس لئے آپ حضرات ہی اس امانت کے وارث ہیں اور آپ ہی کو انبیائے کرام علیہم السلام کی نیابت کا فرض ادا کرنا ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل

میری امت کے علماء انبیائے بنی اسرائیل کی طرح ہیں۔

پہلا فرض، تبلیغ

تحصیلِ علمِ دین، اس میں رسوخ حاصل کرنے اور تزکیۂ باطن کے بعد سب سے پہلا فریضہ جو آپ حضرات پر عائد ہوتا ہے، وہ علوم دینیہ کو دوسرے لوگوں تک پہنچانا ہے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کوئی مدرسہ کھول کر بیٹھ جائیں اور وہاں علمِ دین کی تعلیم کا سلسلہ جاری کریں جو ایک ضروری اور بنیادی کام ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ بظاہر ایسا ممکن نہیں کہ ہر ہر عالم ایک مدرسہ جاری کرے۔ اس لئے تبلیغ کے دوسرے ذرائع بھی اختیار کرنے ضروری ہیں۔ جو بذریعۂ وعظ و نصیحت بخطابِ خاص اور بخطاب عام۔ اصلاحِ معاشرہ وغیرہ کی صورتوں میں ہوں گے۔

تبلیغ کا طریقہ

تبلیغ کے معنی "پہنچانا" اور اصطلاحِ شرع میں دین کے احکام دوسروں تک پہنچانے کو تبلیغ کہتے ہیں۔ یہ دو طرح ہو سکتی ہے۔ ایک تو زبانی۔ دوسرے تحریری۔ زبانی دو طرح سے ہو سکتی ہے۔ ایک بخطابِ خاص۔ دوسری بخطابِ عام۔ ہمارے پیشِ نظر اس وقت تبلیغ بخطاب عام اور تبلیغِ بخطاب خاص ہے۔ اسی کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔

قرآن و حدیث اور اسوۂ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام انتہائی صبر و تحمل، استقلال، واستقامت اور حلم و بردباری کا ہے۔ ایک عالمِ دین کے لئے ضروری ہے کہ وہ جب اس مقدس فریضے کو ادا کرنے کے لئے نکلے تو مخاطب سے ہر قسم کی بات سننے کے لئے تیار رہے۔ اور کسی مرحلے پر بھی مشتعل ہو کر کوئی نامناسب کلمہ زبان سے نہ نکالے۔ بلکہ شفقت، ترحم، محبت اور پیار سے سمجھائے۔ مخاطب کی پوری ہمدردی قلب میں موجود ہو اور نہایت دلسوزی اور توجہ سے بات کرے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید

کا ارشاد ہے

فقولا لہ قولا لینا لعلہ	تم دونوں اس سے نرم گفتگو کرنا
یتذکر او یخشی	شاید کہ وہ نصیحت قبول کرلے یا اللہ سے ڈرے۔

یہ خطاب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام سے کہ تم دونوں فرعون کو جاکر تبلیغ کرو۔ مگر بات نرمی سے کرنا۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب ہے، اس کو معلوم تھا کہ فرعون کو خواہ نرمی سے خطاب کیا جائے یا سختی سے۔ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ اس لئے اب تو صرف حجت اور ایک ضابطہ پورا کرنا ہے۔ خطاب کسی طرح بھی ہو۔ مگر باوجود اس کے، نرمی سے بات کرنے کا حکم دینا، دلیل ہے اس بات کی کہ تبلیغ کا ادب اور اس کا تقاضا یہی ہے کہ نرمی سے بات کی جائے۔ لہٰذا علمائے کرام کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جب فریضۂ تبلیغ ادا کریں تو سراپا رحمت و شفقت اور خیر خواہ بن کر کریں۔ بلکہ موقع اور محل کی مناسبت سے بھی کام لیں جیسا کہ ارشاد ہے

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ	اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف حکمت سے دعوت دیجئے اور بہترین نصیحت کے ساتھ اور احسن طریقے سے مباحثہ کیجئے۔

اس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تبلیغ کے آداب بیان فرما دیئے گئے۔ کیوں کہ جب انسان اس نازک کام کے لئے نکلتا ہے تو اولاً تو مخاطب کے سامنے اپنا مدعا پیش کرنا ہوتا ہے، اس کو "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ" سے ظاہر فرمایا۔ مدعا پیش کرنے کے دو طریقے ہیں۔ اول تو یہ کہ انسان بے پروائی سے عام انداز میں ضابطے کے مطابق اپنی بات کہدے۔ دوسرا یہ کہ پہلے سے پروگرام بنا کر بات کرے مثلاً یہ کہ پہلے

تمہید باندھے پھر کچھ شواہد و دلائل کی طرف آئے، اس کو "بالحکمۃ" سے ظاہر فرمایا۔ اس کے بعد کا قدم یہ ہے کہ جب اصل مقصد و مطلب پر آئے تو نہایت حسین انداز سے نصیحت کا پہلو لے کر بات کرے۔ مقابلہ اور معارضہ طعن و تشنیع کی صورت نہ ہو، بلکہ ہمدردی، دلسوزی اور توجہ کے ساتھ حسین الفاظ، مناسب طرز تکلم اور اعلیٰ طریقہ سے خطاب کرے۔ اس کے باوجود بھی اگر مخاطب کوئی نامناسب پہلو اختیار کرے اور بحث و مناظرہ پر اتر آئے یا مشتعل ہو جائے اور کچھ غیر مہذب گفتگو کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ بحث کا جواب تو بحث و مناظرہ ہی سے دیا جائے گا، مگر ہدایت فرمائی کہ اگر بحث و جدال کی نوبت آجائے تو اس کو بھی ایسے پہلو سے اختیار کرو جو بہت ہی حسن و خوبصورتی کا حامل ہو، نہ غصہ ہو، نہ جوش ہو، نہ اشتعال ہو، نہ غیر مناسب گفتگو ہو۔ بلکہ اپنے جذبات پر قابو پاکر نہایت سنجیدگی اور متانت سے بات کی جائے۔

بہرحال حکیمانہ استدلال ہو یا وعظ و نصیحت، یا جدال و مناظرہ اور بحث و تکرار، ایک مبلغ اور داعی کے لئے یہ بات لازم ہے کہ اپنے مخاطب سے نرمی اور خیر خواہی سے گفتگو کرے اور شدت و سختی نہ آنے دے۔ کیوں کہ سختی و شدت کا طریق، مخاطب کے دل میں نفرت، عداوت اور ضد کے جذبات پیدا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ قبولِ حق کے لئے آمادہ نہیں ہوتا اور اس طرح تبلیغ کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح دعوت و تبلیغ میں مخاطب کی بدسلیقگی یا بدتہذیبی و بدزبانی کو برداشت۔ اور اس کی ان باتوں سے درگزر کرنا اور ان سب باتوں کے باوجود بھی اس کو خیر خواہی سے نصیحت کرنا اور گفتگو کا ایسا مؤثر انداز اختیار کرنا جو دل میں گھر کر جائے، نہایت ضروری ہے۔

اس کی نظیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ اسوۂ حسنہ ہے کہ جب آپ نے بحکم خداوندی کوہِ صفا پر چڑھ کر اہل مکہ کو حق کی تبلیغ کرنے کے لئے جمع فرمایا۔ تو آپ نے اصل مدعا بیان فرمانے سے پہلے ہی فرمایا کہ

" اگر میں تم کو یہ خبر دوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے غنیم چھپا ہوا ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے۔ تو کیا تم لوگ میری اس بات کو تسلیم کر لو گے ؟"

سب نے باتفاق رائے یہ کہا کہ

"بے شک ! ہم تسلیم کر لیں گے۔ کیوں کہ ہم نے ہمیشہ آپ کی ہر بات کو سچا پایا"۔

مگر جب آپ نے یہ فرمایا کہ

" اگر یہ بات ہے تو سن لو کہ اللہ ایک ہے اور حساب و کتاب کا دن آنے والا ہے۔ وغیرہ"

تو اُن سب کے تیور بدل گئے اور اَول فول بکنا شروع کر دیا۔ پھر آپ نے ان کو نرمی اور شفقت و رحمت سے سمجھانے کی کوشش کی۔

اسی طرح دین کو آسان کر کے پیش کرنا، لوگوں کو خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا۔ وغیرہ۔ یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک داعی و مبلغ کے لئے از بس ضروری ہیں اور ان پر کاربند رہ کر ہی اس راہ میں کامیابی کی اُمید کی جا سکتی ہے۔

اصلاحِ معاشرہ

یاد رکھئے کہ آج معاشرے میں جن برائیوں نے جنم لے رکھا ہے اور جس کی وجہ سے لوگوں کی زندگی دینی لحاظ سے بے کیف ہے اور خطرناک حد تک بگڑ چکی ہے' اس کی طرف توجہ کرنا بھی علمائے کرام کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ آج اگر دیکھا جائے تو "اصلاحِ معاشرہ" کا بہت چرچا ہے۔ حکومت کی سطح پر بھی اور دیگر رہنمایانِ قوم کی طرف سے بھی۔ اجتماعی طور پہ بھی اور انفرادی طور پہ بھی۔ کثرت سے لوگ اصلاحِ معاشرہ کے لئے کام کر رہے ہیں مگر عرصۂ دراز سے اس کا چرچا ہونے کے باوجود کوئی صورت اصلاحِ معاشرہ کی نظر نہیں آ رہی۔ بلکہ معاشرے میں بگاڑ ہی بگاڑ بڑھتا جا رہا ہے دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ گھر گھر' گلی گلی' شہر شہر' اس کی لپیٹ میں ہے۔ بھائی بھائی کا دشمن ہے۔ باپ بیٹے کا اور بیٹا باپ کا' دوست دوست کا' تاجر تاجر کا' زمیندار زمیندار کا۔ غرض ہر طبقے اور ہر سطح پہ معاشرے میں فساد برپا ہے۔ بے حیائی' عریانی' افلاس' جہالت' غفلت' بے حسی' خود غرضی' یہ وہ چیزیں ہیں جو عام ہو چکی ہیں۔ کہاں تک بتایا جائے۔ ؎

دل میں جگر میں سینے میں پہلو میں درد ہے
اے چارہ گر! بتا کہ بتاؤں کہاں کہاں ؟

اگر اس سیلاب کو روکنے کی کوشش نہ کی گئی تو بہت جلد یہ لاعلاج ہو کر رہ جائے گا۔ اور قوم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جب حکومت سمیت، قوم کے بہت سے افراد، تنظیمیں اس کے لئے کام کر رہی ہیں تو یہ کام کیوں نہیں ہوتا۔

وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ہر کام کے کرنے کا ایک طریقہ مقرر فرما دیا ہے۔ کہ وہ کام اُسی طریقے سے ہوتا ہے۔ بے طریقہ کام نہیں ہو سکتا۔ سو اس کے لئے بھی طریقہ مقرر ہے۔ جب تک اُس طریقے سے کام نہ کیا جائے گا، تب تک کامیابی نہیں ہو گی۔ اس لئے وہ طریقہ بیان کیا جاتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی اصلاحِ معاشرہ، اگر ہو سکتی ہے تو وہ صرف شریعت اور دین پر چل کر ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ دین کیا ہے؟

دین کیا ہے؟

صرف نماز روزہ وغیرہ کی پابندی کرنا، دین نہیں، بلکہ دین کا ایک حصّہ ہے۔ درحقیقت دین کے پانچ اجزاء ہیں۔ جب تک پانچوں اجزا نہ ہوں، دین نامکمل رہتا ہے۔ جیسے آپ کو کوئی کھانا پکانا ہو۔ مثلاً پلاؤ پکانا ہے۔ تو اس کے لئے گوشت۔ چاول۔ نمک۔ گھی وغیرہ اجزاء ہیں۔ ان میں سے کسی ایک چیز کو پلاؤ نہیں کہا جا سکتا اسی طرح دین کی تکمیل کے لئے پانچ اجزاء ہیں۔

دین کے پانچ اجزاء

پہلا جز عقائد

عقائد: جمع ہے "عقیدہ" کی۔ اور عقیدہ کہتے ہیں "گرہ" کو۔ مطلب یہ کہ دین کی وہ

باتیں جن کا ماننا ضروری ہے' اور وہ بنیادی حیثیت رکھتی ہیں کہ ان کے بغیر انسان مومن نہیں کہلا سکتا۔ انسان کے دل میں گرہ کی طرح مضبوط جمی ہوتی ہوں کہ کوئی شیطان وغیرہ انسان کے دل میں ان کے خلاف کسی قسم کا شبہ پیدا نہ کر سکے۔ عقائد بہت ہیں۔ نمونے کے طور پر چند ذکر کئے جاتے ہیں۔ توحید۔ رسالت۔ قیامت۔ فرشتے۔ اللہ کی باتیں۔ جنت۔ دوزخ۔ وغیرہ۔

جب ایک انسان صحیح عقیدوں کو اپنا لیتا ہے تو اس کے خیالات' فکر اور سوچ اور فہم درست ہو جاتے ہیں۔ وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ سکتا ہے' نہ سوچ سکتا ہے جو خدا اور اس کے رسول کے احکام کے خلاف ہو۔ اس سے انسان کی زندگی کی صحیح سمت متعین ہو جاتی ہے اور وہ زندگی میں فکر اور سوچ کی غلطیاں کرنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے کفر' شرک' الحاد' زندقہ' فسق اور فجور وغیرہ ہر قسم کی گمراہی سے بچا رہتا ہے۔

دوسرا جز عبادات

دین کا دوسرا جز "عبادات" ہیں۔ یہ جمع ہے عبادت کی۔ اور یہ لفظ "عبد" سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں "غلام" لہٰذا عبادت کے معنی "غلامی" ہوتے۔ یعنی عبادات وہ ہیں کہ جن کو انسان اللہ و رسولؐ کا حکم سمجھ کر بجالاتا ہے۔ اپنی سوچ اور فکر کا اس میں دخل نہیں ہوتا۔ کیوں کہ غلام کا کام فرمانبرداری کرنا ہے کہ جو حکم آقا کی طرف سے ملے' اسے بے چون و چرا بجالائے۔ جیسا کہ اس لفظ کے مفہوم کا یہی تقاضا ہے۔ کیوں کہ غلام بھی خدمت کے لئے ہوتا ہے اور نوکر اور ملازم بھی۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ ملازم کی خدمات متعین ہوتی ہیں۔ مثلاً اپنے گھر میں ایک ملازم' بطور باورچی کے رکھا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ذمے کھانا پکانا ہے۔ اگر آپ اس سے کسی وقت یہ کہیں کہ ہمارے باغیچے کے پودوں کی آبیاری کرو اور ان کی تراش خراش اور لان کی گھاس کاٹو۔ تو اس کو حق ہے کہ وہ ان

کاموں سے انکار کر دے اور کہے کہ یہ میرا کام نہیں۔ یہ کام مالی کا ہے۔ مجھ سے کھانا پکوایئے۔ اس کے برخلاف، غلام کی خدمات متعین نہیں ہوتیں بلکہ اس سے جو کام، جس وقت کہا جائے، اسے کرنا پڑے گا۔ اگر ایک وقت اس سے کہا جائے کہ کھانا پکاؤ، تو اسے کھانا پکانا ہوگا۔ دوسرے وقت اگر باغیچے کی دیکھ بھال کو کہا جائے تو وہ بھی کرنا پڑے گا۔ کسی وقت اگر مالک اس کو حکم دے کہ ہمارا لباس پہن کر، ہماری سواری میں سوار ہو کر، فلاں جگہ جا کر ہماری نیابت کرو تو وہ بھی کرنا ہوگا۔

مقصد اس تفصیل کے عرض کرنے سے یہ ہے کہ انسان کا تعلق اللہ کے ساتھ عبدیت یعنی غلامی کا ہے۔ منابطے (یعنی نوکری اور ملازمت) کا نہیں۔ یہ معنی ہیں عبادت کے، اسمیں نماز روزہ حج زکوٰۃ اور دیگر اعمال صالحہ آ گئے۔

تیسرا جز اخلاق

اخلاق، جمع ہے "خلق" کی۔ جس کے معنی ہیں "عادت"۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ انسانوں میں ہر قسم کی عادتیں ہوتی ہیں۔ اچھی بھی۔ بُری بھی۔ اور اس پر بھی ساری دنیا کا اتفاق ہے کہ اچھی عادتوں کو اختیار کرنا چاہیئے اور بُری عادتوں سے بچنا چاہیئے۔ لیکن اس کے باوجود انسان اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ دنیا میں کون کونسی عادتیں اچھی ہیں اور کون کون سی بُری ہیں بلکہ اس سلسلے میں خاصا اختلاف ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایسی باتوں کا فیصلہ کرنے کے لئے انسان کے پاس دو چیزیں ہیں۔ ایک عقل۔ دوسرے جذبات یعنی طبعی تقاضے۔ کسی عادت کے اچھا یا بُرا ہونے کا فیصلہ کرتے وقت، اگر انسان پر، جذبات اور نفسانیت غالب ہے تو وہ اسی کے مطابق فیصلہ کریگا۔ اور اگر عقل غالب ہے تو وہ عقل کے مطابق کریگا۔ اب چونکہ دنیا میں عقلیں اور جذبات و شہوات مختلف ہیں۔ اس لئے فیصلے بھی مختلف ہوں گے۔ کچھ لوگ ایک عادت کو اچھا کہیں گے اور کچھ لوگ اُسی کو بُرا ٹھہرائیں گے۔ اس طرح اچھے بُرے کا کوئی متفق علیہ یا صحیح فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔

اچھائی، برائی، نیکی، بدی، حسن و قبح کے بارے میں متعدد گروہ بن جائیں گے اور انسانیت ہزاروں گروہوں اور ٹکڑیوں میں بٹ کر انتشار کا شکار ہو جائے گی اور جمعیت فنا ہو جائے گی جو جان ہے اقوامِ عالم کی۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے بُرے اخلاق کی پہچان اللہ تعالیٰ نے بندوں کی صوابدید پر نہیں چھوڑی۔ بلکہ اچھے بُرے کا فیصلہ خود فرما دیا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اچھے بُرے اخلاق کی فہرست بنا کر ہمارے ہاتھ میں دے دی۔ چنانچہ اچھے اخلاق میں تو، تواضع، حلم، بردباری، صبر و شکر، زہد، تقویٰ، قناعت وغیرہ۔ اور بُرے اخلاق میں تکبر، ظلم، حسد، کینہ، بغض، حب دنیا، حب جاہ، حرص وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح قیامت تک ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ جبکہ انسانی تجویز میں یہ خرابی بھی ہوتی ہے کہ اس کی رائے بدلتی رہتی ہے۔ ایک چیز، جس کو آج اچھی سمجھتا ہے، کچھ عرصے کے بعد اُسی کو بُرا سمجھنے لگتا ہے اور برعکس۔

حکم یہ دیا گیا کہ اچھے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو اور بُرے اخلاق سے پرہیز کرو۔ اب ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے یہ فہرست یکساں ہے۔ جس کی وجہ سے امت میں مرکزیت اور جمعیت قائم ہے۔

چوتھا جز معاملات

معاملات، جمع ہے "معاملہ" کی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جو ضرورتیں پیش آتی ہیں اور ان کے لئے آپس میں لین دین وغیرہ کرنا پڑتا ہے، اس کو معاملہ کہتے ہیں۔ جیسے خرید و فروخت۔ رہن۔ قرض ادھار، کرایہ داری۔ نکاح۔ طلاق وغیرہ۔ اگرچہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں میں انسان کو اسلامی راہنمائی کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ تو انسانوں کے ذاتی اور آپس کے کام ہیں، وہ جیسے مناسب ہو کر لیں۔ مگر یہاں بھی وہی سوال ہے کہ اگر انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے تو نت

نئے طریقے نکلنے شروع ہوجاتیں اور زیادہ سمجدار لوگ، کم عقل والوں کو بے وقوف بناکر اپنا نفع پیشِ نظر رکھیں اور دوسرے کو نقصان پہنچا دیں۔ اس لئے شریعت مطہرہ نے ان سب کے لئے قوانین وضع کئے اور اس کام میں بھی یکسانیت پیدا فرمادی۔

پانچواں جزمعاشرت

معاشرت کے معنیٰ "ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا"۔ چونکہ انسان، دنیا میں تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس لئے اس کو دوسروں کی احتیاج ہے اور اسی وجہ سے دوسروں سے تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کا واسطہ، گھر والوں۔ خاندان والوں۔ محلہ والوں۔ بستی والوں۔ دوکانداروں۔ مزدوروں کاریگروں سے پڑتا ہے۔ تو اس میں ہر ہر شخص یا ہر طبقے کے ساتھ کیا اور کیسا برتاؤ کرے؟۔ یہ بھی ایسا ہی سوال ہے کہ ہر شخص اپنی سوچ اور فکر سے اگر کرے گا تو اختلاف پیدا ہوگا۔ لہٰذا شریعت نے اس بارے میں بھی اصلاحی اور انقلابی تعلیمات عطا فرمائیں۔ جو ایک مرکزیت کی حیثیت اختیار کرگئیں۔ اس معاشرت ہی کو "معاشرہ" کہتے ہیں۔ جس کے بگاڑ کا رونا رویا جارہا ہے اور ہر شخص اصلاحِ معاشرہ کی فکر میں ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کیسے ہو؟

اس کا طریقہ صرف اور صرف یہ ہے کہ سب سے پہلے قوم کے عقائد درست کرنے کی طرف توجہ کی جائے کیوں کہ عقائد درست ہونے کے بعد ہی دوسری چیز یعنی عبادات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ ایک شخص کے اگر عقائد ہی درست نہ ہوں تو اس سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ عبادات بجا لائے گا۔

عبادات میں لگنے کے بعد اس کی توجہ "اخلاق" کی طرف مبذول کرائی جائے کیوں کہ

عبادت میں مشغول ہونے کے بعد اخلاق کی اصلاح آسان ہو جاتی ہے وجہ یہ کہ عبادات میں بھی اصلاحِ اخلاق کی خاصیت رکھی گئی ہے۔ جیساکہ ارشادِ خداوندی ہے کہ

انّ الصّلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر — بے شک نماز بے حیائی کی باتوں اور برائی سے روکتی ہے۔

روزے کے بارے میں ارشاد ہے

لعلّکم تتقون — (روزہ رکھنے سے) تم متقی بن جاؤ گے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادات میں اصلاحِ اخلاق کی خاصیت ہے۔ کہ اصلاحِ اخلاق کا مقصد یہی ہے کہ بُرے کاموں سے بچے اور اچھے کاموں میں لگ جائے۔

جب عقائد و اعمال کی اصلاح سے اخلاق کی اصلاح ہو جائے گی تو انسان کے معاملات خود بخود درست ہونے شروع ہو جائیں گے۔ وجہ یہ کہ جب ایک شخص کے اخلاق درست ہیں، کہ جھوٹ وہ نہیں بولتا۔ کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ کسی کو حقیر و ذلیل نہیں سمجھتا۔ ہر شخص کو اپنے سے اچھا اور برتر سمجھتا ہے۔ نہ اس میں حرصِ مال ہے نہ حب جاہ۔ تو ایسا شخص معاملات میں کیسے خرابی پیدا کرے گا۔ مطلب یہ کہ معاملات کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔ تھوڑی توجہ کی ضرورت ہو گی۔

جب اصلاح عقائد سے لے کر اصلاحِ معاملات تک، انسان درست ہو جائے گا تو پھر اس کی معاشرت بھی خود بخود سنور جائیگی۔ کیوں کہ معاشرت کی جملہ خرابیاں جنم لیتی ہیں انہی چیزوں سے۔

تو اصلاح معاشرہ کا طریقہ یہ ثابت ہوا کہ ایسی تربیت گاہیں قائم کی جائیں جہاں لوگوں کو اور خاص کر نوجوانوں کو ان پانچوں اجزاء کی تربیت دی جائے۔ اس طرح کچھ عرصے میں میں معتدبہ جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہو جائے گی، جن کو دیکھ دیکھ کر لوگوں کی اصلاح ہو گی۔

جیساکہ شور مچایا جا رہا ہے اصلاح معاشرہ کا۔ تو صرف شور مچانے، مضامین لکھنے، تقریریں

کرنے، جلسے کرنے اور جلوس نکالنے سے ہرگز اصلاحِ معاشرہ نہ ہو گی (جیسا کہ اب تک نہیں ہو رہی) جیسے ایک شخص مسجد بنانا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بنیادیں بھرو۔ پھر دیواریں کھڑی کرو پھر چھت ڈالو۔ مسجد بن جائے گی۔ لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ پہلے چھت ڈال لوں، تو یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح بغیر اصلاحِ عقائد و اعمال و اخلاق و معاملات، کوئی یہ چاہے کہ اصلاحِ معاشرہ ہو جائے تو یہ بھی ناممکن ہے۔ جیسے کوئی یہ چاہے کہ کھانا پکائے تو بعد میں مگر کھالے پہلے۔

اس سلسلے میں علمائے کرام سے درخواست ہے کہ وہ دیگر دینی امور کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ اصلاحِ معاشرہ کے لئے بھی صحیح بنیادوں پر کام کریں۔ یعنی ایسی تربیت گاہیں قائم کریں کہ جن میں لوگوں کو مذکورہ بالا ترتیب کے ساتھ تربیت دیکر تیار کیا جائے۔

موجودہ معاشرتی تبدیلیاں
اور ان کے پیشِ نظر علماء کا ردِ عمل

موجودہ زمانے کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آج کے زمانے کا اگر ایک سو سال قبل کے زمانے سے مقابلہ کیا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کوئی اور دنیا تھی اور آج کوئی دوسری دنیا ہے۔ زمانہ بدل گیا، تقاضے بدل گئے، قدریں بدل گئیں، ذہن بدل گئے۔ اچھے بُرے کا معیار بدل گیا۔ اور اب لوگوں کو ایک سو سال یا دو سو سال بلکہ چودہ سو سال پیچھے لے جانا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن مایوسی اور نا اُمیدی کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ ضرورت حکمت، مسلسل عمل، استقلال و استقامت کی ہے۔ اس سلسلے میں ضرورت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے تعلیم حاصل کی جائے۔ آپ نے جب دعوۃ و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تو ایسے ناسازگار اور

بدترین حالات میں کیا کہ شاید اس کی مثال ملنی مشکل ہو۔ مگر حالات مسلسل نامساعد، مخالف اور ناسازگار ہونے کے باوجود، آپ کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لغزش پیدا نہ ہوئی اور آپ صبر و استقلال، ہمت و عزم کے ساتھ ساتھ نرمی، محبت، ہمدردی، خیر خواہی اور دلسوزی کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی طور پر پیغامِ حق پہنچاتے رہے۔ آخر کار آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی شاندار کامیابی عطا فرمائی کہ اس کی بھی تاریخ میں نظیر نہیں۔

اسی طرح آج آپ حضرات کے لئے مایوسی و نا اُمیدی کی کوئی وجہ نہیں۔ عزم و ہمت کے ساتھ آگے بڑھیئے اور شیطان نے جو اپنا تخت بچھا رکھا ہے اس کو اُلٹ دیجئے۔

کام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ احکامِ شریعت میں درجہ بدرجہ، فرض۔ واجب۔ سنت۔ مستحب۔ افضل اور مباح چیزیں ہیں۔ جن کے درجات اور مقامات سے آپ حضرات بخوبی واقف ہیں۔ ان میں سے فرائض و واجبات میں تو ظاہر ہے کہ کسی قسم کی ڈھیل نہیں دی جا سکتی۔ کیوں کہ اس میں ڈھیل دینے اور کمزور پڑ جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ دین ہی سے دستبردار ہو گئے۔ لیکن کسی کو فرائض و واجبات پر قائم کرنے کے لئے اگر صلح و آشتی اور محبت و اُلفت کا طریقہ اپنایا جائے اور صرف ایک ضابطہ سا ہی نہ پورا کر دیا جائے تو اُمید ہے کہ بہت کامیابی ہو گی۔ کیوں کہ بات کرنے کا انداز، خطاب کرنے کا طریقہ، ہمدردی و دلسوزی کا مظاہرہ۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ پتھر کو بھی موم کر دیتی ہیں۔

اس کے بعد نمبر آتا ہے اعمالِ مسنونہ کا۔ تو اس بگڑے ہوئے دور میں جب تک کسی کو فرائض و واجبات پر پختہ نہ کر لیا جائے، اُس سے توقع مشکل ہے کہ وہ سنن و مستحبات کا پاس کرے گا۔ لہٰذا جس کو فرائض و واجبات پر لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس کو سنن و مستحبات پر سختی نہ کرو۔ بلکہ جب وقت آئے تب توجہ دلاؤ۔

رہے افضل اور مباحات۔ تو ان کا درجہ تو سب سے بعد میں ہے۔ بعض حضرات اِس سلسلے میں اپنی ذاتی پسند و ناپسند دوسروں پر بھی جاری کرنا چاہتے ہیں۔ جس کی وجہ

سے وہ فرائض و واجبات سے بھی باغی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جہاں شریعت نے رخصت اور گنجائش دی ہے۔ وہاں علمائے کرام حضرات کو بھی وسعت سے کام لینا چاہیئے۔ کیوں کہ آج دور ایسا ہے کہ کوئی شخص فرائض و واجبات ہی پورے کرلے تو غنیمت ہے۔ یہ سلسلہ یعنی فرائض و واجبات و سنن و مستحبات و مباحات و افضل کا زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہے۔ جس میں آج کل سب سے زیادہ انہماک لوگوں کو معاشی امور میں ہے اس لئے ہر جگہ حسبِ ضرورت اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاش حاصل کرنے اور پیسہ کمانے کے لئے بھی شریعت مقدسہ نے اصول و قواعد عطا فرمائے ہیں، حدود و قیود مقرر کی ہیں اور حلال و حرام کی تمیز کی ہے مگر اس کے باوجود یہاں بھی وہی درجات ہیں۔ لہٰذا ہر جگہ اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ دین کو سہل بنا کر اس طرح پیش کیا جائے کہ دین کی رُوح باقی رہے اور عمل کرنے والے کو کچھ سہولت حاصل ہو جائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہے کہ جب کبھی آپ کو دو کاموں کے کرنے میں اختیار دیا گیا۔ آپ نے ہمیشہ ان میں سے آسان پہلو کو اختیار فرمایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ اُمت کے لئے تعلیم ہے اور اُمت کے لئے سہولت اختیار فرمائی گئی ورنہ آپ تو مشکل پہلو کو بھی اختیار فرما کر نبھا سکتے تھے۔ اسی طرح آپ نے دو حضرات کو حاکم بنا کر بھیجنے کا فیصلہ فرمایا تو ان کو منجملہ ہدایات کے، یہ بھی امر فرمایا کہ

یسرا ولا تعسرا وبشرا	لوگوں پر آسانیاں کرنا۔ سختیاں نہیں۔
ولا تنذرا	اور لوگوں کو خوشخبریاں سنانا۔ ڈرانا دھمکانا نہیں۔

غور کیا جائے تو ان دو جملوں میں رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف دعوۃ و تبلیغ کا طریقہ ارشاد فرما دیا بلکہ حکومت کرنے کا انداز بھی سکھلا دیا۔

غرض آج کے بدلے ہوئے حالات، خاص کر معاشی و معاشرتی حالات، بدلے ہوئے

اذہان اور بدلے ہوئے رجحانات کو سامنے رکھ کر حکمت سے کام لینے کی بڑی ضرورت ہے۔ اور یہ چیز حاصل کرنے کے لئے اپنے نفس پر قابو پانا ضروری ہے۔ اس کے لئے جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے۔ کیوں کہ ہر نیکی کا کام کرنے میں رکاوٹ اور خرابی، سب سے پہلے نفس ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

اسی طرح آج معاشرت میں بڑی تبدیلی آگئی۔ اول تو نئی نئی ایجادات نے نظام زندگی تبدیل کر کے رکھ دیا۔ پھر روپے پیسے کی بہتات نے ذہنوں میں زبردست انقلاب برپا کر دیا۔ روپے پیسے کی بہتات، شریعت کی نظر میں کوئی بُری چیز نہیں، بلکہ یہ ایک نعمت ہے۔ اس سے انسان کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ دل کو اطمینان رہتا ہے۔ دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے بھی اس کی ضرورت ہے وغیرہ۔ مگر یہاں پر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دین کی تعلیمات میں کسی جگہ مال کی مذمت نظر آتی ہے اور کسی جگہ اس کی تعریف کی گئی ہے۔ ایسے میں ایک سطحی نظر رکھنے والا انسان، فیصلہ کرنے میں حیران ہو جاتا ہے کہ کس شق کو اختیار کرے۔ اس لئے اس کے بارے میں مختصراً اصولی بات سمجھ لیجئے۔

اس جگہ دو چیزیں ہیں۔

(۱) کسبِ مال۔ یا کسبِ دنیا۔

(۲) حبِ مال۔ یا حبِ دنیا۔

پہلی چیز منع نہیں، بلکہ بقدر ضرورت تو ضروری ہے۔ اور ضرورت سے زائد، مباح ہے۔ لیکن بہر حال مال کمانے اور دنیا حاصل کرنے میں حلال و حرام کا خیال رکھنا فرض ہے۔ صرف انہی ذرائع سے مال کمایا جا سکتا ہے جو شریعت نے حلال قرار دیئے ہیں۔ حرام ذرائع سے مال کمانا ہرگز درست نہیں۔

دوسری چیز بالکل منع ہے اور سختی سے روکا گیا۔ حتیٰ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

حب الدنیا راس کل خطیئۃ ——— دُنیا کی محبت تمام برائیوں اور گناہوں کی جڑ ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ "کسبِ دنیا" بطریق حلال تو جائز، بلکہ مطلوب۔ اور کسب کے بعد اس سے محبت رکھنا ممنوع۔ یعنی مال و دولت سے ایسا تعلق اور محبت کہ انسان مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرے بلکہ مال ہی کو مقصود سمجھ لے۔ یہ ہے ہر خرابی کی جڑ۔ لیکن اگر مال کما کما کر اللہ کی راہ میں اور جائز ضرورتوں میں خرچ کرتا ہے تو پھر یہ وہ مال ہے جس کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

نعم المال الصّالح للرجل الصّالح — نیک انسان کے لئے اچھا مال، عمدہ چیز ہے۔

اس کو ایک واقعے سے سمجھئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک صاحب نے بہت مال جمع کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بُلا کر کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا سارا مال خدا کی راہ میں دے دو اور بیت المال میں جمع کر دو۔ انہوں نے کہا کہ ایسا کرنے کی تو ہمت نہیں۔ فرمایا کہ اچھا تمہاری مرضی۔ مگر چند روز کے بعد ان کو پھر بُلایا اور یہی گفتگو ہوئی۔ پھر کچھ روز کے بعد بلایا اور یہی باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد وہ صاحب خود حاضر ہوئے اور کہا کہ یا امیر المؤمنین! میں اپنا سارا مال بیت المال میں دینا چاہتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اب اس مال کو تم اپنے پاس رکھو۔ بیت المال میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں۔ مطلب ظاہر ہے کہ پہلے اُن کے دل میں مال کی محبت تھی جو انسان کے لئے تباہ کن ہے۔ اب محبت نکل گئی تو یہ مال نہ صرف یہ کہ بے ضرر ہو گیا بلکہ نافع ہو گیا۔ جیسا کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے ہی موقع پر اس بات کو ایک مثال سے سمجھایا ؎

آب در کشتی ہلاکِ کشتی ست
آب بیروں، زیرِ کشتی پشتی ست

یعنی پانی اگر کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو کشتی کے لئے ہلاکت و بربادی کا سبب ہے اور اگر کشتی سے باہر رہے تو کشتی کے لئے سہارا ہے۔ اور فرمایا کہ ؎

مالِ را گر بہرِ دیں باشی حمول
نعم مال صالح گفتہ رسولؐ

یعنی اگر مال کو اس لئے جمع کر رہا ہے کہ دین کے کام میں خرچ ہو تو یہ وہ مال صالح ہے جو مردِ صالح کے لئے مفید ہی مفید ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لہٰذا اس سلسلے میں بھی مدِ نظر یہ رہے کہ ناجائز طریقوں سے دولت کمانے اور بخل سے تو منع کیا جائے۔ مگر مال کمانے سے منع کرنے کی کوشش کرنا خلافِ مصلحت ہے۔

احتسابِ اقتدار

اس دور میں جہاں زندگی کے ہر شعبے میں خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ وہاں حکومت اور طرزِ حکومت میں بھی بے شمار چیزیں قابلِ اصلاح موجود ہیں۔ ان کی اصلاح کی طرف توجہ کرنا بھی علماء کے فرائض میں داخل ہے۔ کیوں کہ یہی ایک ایسا طبقہ ہے کہ جو یہ کام کر سکتا ہے۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ کام کو شروع کرنے سے قبل اپنے دل و دماغ اور ذہن و فکر کو اس سے پاک کر لیا جائے کہ حکامِ وقت سے کسی قسم کا کوئی نفع حاصل کریں گے۔ اور اس سلسلے میں اُن حضرات کی ہر پیشکش کو خوبصورتی اور تہذیب کے ساتھ نامنظور کر دیں گے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ حکام کے پاس جا کر تبلیغ و تعلیم کے بعد اگر ان سے

اپنی کوئی حاجت بھی پیش کردی یا ان کی کسی پیشکش کو قبول کر لیا تو یہ اصلاح کی کوشش بالکل بے اثر اور ناکام ہو جاتی ہے بلکہ اُلٹا اثر ہوتا ہے کہ حکام یہ سمجھتے ہیں کہ اصل مقصود تو ان کا یہ تھا۔ تبلیغ و اصلاح کو بہانہ بنایا۔

اصلاحِ اخلاق و کردار

اس سلسلے میں اُوپر کی سطور میں تفصیل سے عرض کیا جا چکا کہ دین کے پانچ اجزاء ہیں جن کی تعلیم و تربیت قوم کے ہر طبقے کو دی جانی بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر معاشرہ میں امن و سکون پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جیسے ممکن ہو اور جتنا بس چلے، آپکو یہ کام کرنا چاہیئے۔

علماء کرام کیلئے لمحۂ فکر

جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا ہے کہ باوجودیکہ آج بفضلہ تعالیٰ علماء کی کثرت ہے مگر پھر بھی عام طور پر لوگ علماء سے گریزاں ہیں۔ علماء کے قریب نہیں آتے۔ جس کی وجہ سے بظاہر تو وہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں نہ کہ علماء کا۔ اس لئے اگر علماء، عوام کے اس رویے کی پروا نہ کریں تو علماء کا کیا بگڑتا ہے؟ یہ سوچ کر علماء اس طرف توجہ نہ کریں۔ یا کیوں کریں؟

لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ مندرجہ بالا بات درست ہونے کے باوجود، علماء کی شان اور ان کے مقام کے منافی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ حضرات کا ایک تعلق تو عامۃ المسلمین سے ضابطہ کا ہے اور ایک تعلق وہ ہے جو آپ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ورثہ میں ملا ہے۔ اور وہ ہے شفقت علی الخلق اور رحمت و رأفت۔

اس تعلق کی بناء پر آپ کا فرض ہے کہ آپ قوم کے افراد کی بے راہ روی کو تماشائی بن کر نہ دیکھیں بلکہ اس کی اصلاح کے لئے محبت و شفقت کے جذبات اپنے دامن میں لے کر آگے بڑھیں اور دین سے دور ہونے والوں کو گلے لگائیں۔ ان کے جسم اور ان کے دامن سے کانٹے نکال کر پھول سجائیں اور اس کوشش میں اپنی ذات کو بھول جائیں۔ اس راہ میں ہر قسم کی مشقت و محنت برداشت کریں۔ اگر کچھ ناگوار امور پیش آئیں تو ان کو خندہ پیشانی سے گوارا کریں۔ اگر کچھ سخت و سست سننے کی نوبت آئے تو اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں، بلکہ پھولوں کی بارش سے دیں۔ اپنے اندر ایک لگن، ایک جذبہ بلکہ جنون پیدا کریں اور بمصداق

کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم — لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کرو۔

کے، سب کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکیں۔ بلکہ ہر طبقے اور ہر جگہ اور ہر مقام کے مطابق حکمت حسنِ عمل سے کام لیں۔ علماء کرام سے عام لوگوں کو کچھ شکایات و شکوے بھی ہیں۔ لہٰذا صدق دل اور ٹھنڈے دل سے ان کو سنیں، ان کا جائزہ لیں اور اگر کوئی بات صحیح نظر آئے تو اس کی اصلاح کرنے میں نہ اپنی سُبکی سمجھیں نہ دیر لگائیں۔ بلکہ ان لوگوں کے ممنون ہوں جنہوں نے غلطی کی نشاندہی کی۔ یاد رکھئے کہ دنیا میں آپ کے سامنے آپ کی تعریف کرنیوالے تو بہت ملیں گے مگر آپکی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرنے والا کوئی بھی نہ ملے گا۔ اس لئے اتفاق سے اگر ایسا آدمی مل جائے تو اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ اور فوراً اپنے کردار کا جائزہ لے کر اصلاح کرنی چاہیئے۔

چند عمومی گذارشات

جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا گیا کہ ہم جس طبقے (یعنی علماء) سے مخاطب ہیں، ان کی خدمت میں کچھ عرض کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ اس لئے آپ حضرات کی خدمت میں کوئی بات نصیحت کے طور پر پیش کرنا بھی جرأتِ رندانہ ہے۔ مگر بطور یاددہانی چند وہ باتیں جو سلف صالحین سے منقول ہیں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

شخصی زندگی

ذاتی طور پر ایک عالم، سادگی، پاکیزگی، حلم، بردباری، تواضع و انکساری اور خندہ روئی اور خوش مزاجی کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ زہد و تقویٰ کے ایسے مقام پر ہو کہ بات کریں تو دین کی معلومات میں اضافہ ہو۔ بے کار باتیں جن سے نہ دین کا نفع نہ دنیا کا، ان سے پرہیز۔ معاملات میں کھرا ہونا۔ شرم و حیا کا پیکر ہونا۔ حتی الامکان خدمتِ خلق میں لگا رہنا۔ اخلاق و عمل کا نمونہ ہونا۔

خاندانی زندگی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو فرائض سونپے ہیں ان میں اعزہ و اقارب کے ساتھ حسنِ سلوک کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس لئے اہل خاندان کے جتنے حقوق اپنے ذمے ہوں ان کو پورا کریں اور اپنے جو حقوق اہلِ خاندان کے ذمے ہیں، اُن سے حتی المقدور صرفِ نظر کریں۔ اس طرح اس قدر راحت و آرام سے زندگی گزرے گی کہ بیان میں نہیں آسکتی۔

مساجد میں

علماء کرام کو عام طور پر مسجد کی خدمت کی سعادت حاصل ہوتی ہے اس سلسلے میں یہ نہ سمجھیں کہ مسجد میں ہمارا مقام مخدومیت کا ہے بلکہ مسجد کی ہر خدمت کو اپنے لئے نجات کا ذریعہ سمجھیں اسی طرح مسجد میں آنے والوں کے لئے ہر قسم کی راحت و آرام اور سہولت کا انتظام کرنا اپنے فرائض میں سے سمجھیں۔ آنے والوں کے لئے دینی معلومات حاصل کرنے کا بھی کوئی پروگرام رکھیں۔ ہر نمازی کو اپنا برادر تصور کریں اور ہر شخص سے محبت کا برتاؤ کریں۔۔ اختلافی یا فساد کی باتوں سے حتی الامکان بچیں

وعظ و نصیحت میں

خاص طور پر اس بات کا خیال رکھیں کہ سننے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں لہذا کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے کسی کی دل کی آزاری ہو اور رنج پہنچے۔ حق بیان کریں جس سے باطل خود بخود رد ہو جاتا ہے۔ وعظ کہنے میں خیر خواہی و دلسوزی ہو جذبات کا اتباع نہ ہو۔ بلکہ مقصود اللہ کی رضا ہو۔

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11, M.L. Heights
Mirza Kaleej Baig Road,
Soldier Bazar
Karachi.
MASOOMEEN WELFARE TRUST (R)

حسنِ معاشرت

آپ جانتے ہیں کہ آرام و راحت کی روحِ رواں حسنِ معاشرت ہے۔ اس سلسلے میں لوگوں کو آپ سے بہت توقعات ہیں۔ اس لئے اہلِ خاندان۔ اہلِ محلہ۔ برادری وغیرہ میں بیماروں کی عیادت۔ ضرورت مندوں کی مدد۔ جنازے میں شرکت۔ حسنِ تعلقات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ کی یہ عادات، دوسروں کے لئے نمونہ بنیں گی اور اس طرح حسنِ معاشرت کی راہ ہموار ہوگی۔

آمد و خرچ اور معاش

اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ عام طور پر جو علمائے کرام مساجد کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں ان کی آمدنی محدود ہوتی ہے اور بعض اوقات تنگدستی کی صورت بھی پیش آجاتی ہے۔ ایسے وقت میں آپ حضرات پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ نفس و شیطان بار بار ایسے وسوسے اور خیالات پیدا کرتے ہیں کہ جو شرعاً ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوتے۔ لہٰذا آپ حضرات، جنہوں نے دنیا کو چھوڑ کر دین کو اختیار کیا ہے اور آپ کی ذات عوام کی نظر میں "دین کا نشان" ہے، اپنے اوپر یہ ذمہ داری عائد سمجھیں کہ آپ کے کسی قول، فعل اور کردار سے ہرگز یہ نہ ہو کہ آپ دین کی رسوائی و ذلت کا باعث بنیں۔ بلکہ پورے استغناء اور شانِ بے نیازی سے زندگی گزاریں اور ہرگز کسی گھٹیا آدمی کے سامنے عرضِ حاجت نہ کریں۔ صرف اللہ سے رجوع کریں اور مستقل مزاجی کے ساتھ قناعت و صبر کا دامن تھامے رکھیں۔ بہرحال ہر موقع و محل کے لئے شرعی احکام موجود ہیں، اُن سے سرمو تجاوز نہ کریں۔ یاد رکھیں کہ جو آمدنی، دین کو ذلیل کر کے حاصل کی جائے گی، وہ تو وبال ہی وبال ہوگی۔ اس لئے استغناء۔ بے نیازی، خودداری اور توکل کے ساتھ زندگی گزارنی چاہیئے۔ ہرگز کسی سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔

ملکی و ملّی زندگی میں

اس سلسلے میں بھی علماء کرام پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ آج کل دنیوی اور مغربی سیاست بازی کا دور دورہ ہے۔ ہر کس و ناکس بڑے چھوٹے مسائل پر زبان کھولتا ہے جس میں کچھ باتیں صحیح ہوتی ہیں اور کچھ غلط۔ ایسے مواقع پر احکامِ شریعت کو واضح کرنا اور قوم و ملت کی صحیح راہنمائی اس طرح کرنا کہ حق کی عظمت واضح ہو جائے، ضروری ہے۔

غرض یہ کہ نمونے کے طور پر کچھ باتیں عرض کر دی گئیں اور

ایں قدر گفتیم و باقی فکر کن

کے بمصداق، شریعت کا چراغ ہاتھ میں لے کر حکمت و دانائی کی راہ سے چلیں گے تو انشاء اللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی اور نصرتِ خداوندی آپ پر سایہ فگن ہو گی۔

NAJAFI BOOK LIBRARY
Managed by Masoomeen Welf re Trust (R)
Shop No. 11, M.L. Heights,
Mirza Kaleej Baig Road,
Soldier Bazar, Karachi-74400, Pakistan.

آخری بات

آپ حضرات کی ذات گوناں گوں ذمہ داریوں کی حامل ہے۔ اس لئے موجودہ پُرفتن دور میں بڑی ضرورت ہے کہ آپ کی رفتار و گفتار، آپ کا کردار و عمل، آپ کی پند و نصیحت، آپ کے اخلاق، آپ کے معاملات، اور آپ کا ہر وقت کا رہن سہن ایسا ہو کہ لوگوں کے لئے نمونہ ہو۔ مجالس میں آپ کے کردار کی مثالیں دی جائیں۔ لوگ آپ کے طرزِ عمل کو نمونہ بنائیں۔ جس شخص کی آپ پر نظر پڑے، وہ آپ کی شخصیت سے متاثر ہو، جو آپ کی بات سنے وہ آپ کا نادیدہ مُشتاق ہو جائے۔ آپ کا وجود آپ کے ماحول میں باعثِ برکت خیال کیا جائے۔ غرض آپ صحیح معنی میں اخلاق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہوں اور سلف صالحین کی یادگار ہوں۔

یہ سب باتیں کیسے حاصل ہوں، ان میں سے کچھ امور کی تفصیل ان اوراق میں آپ کی خدمت میں اس توقع پر پیش کی ہے کہ "نمونہ از خروارے" اور "عاقل را اشارہ کافی ست" کے طور پر آپ حضرات کی یاد دہانی کے لئے کافی ہے۔ آخر میں بطور خلاصہ یہ عرض کرنا ہے کہ جو حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ؎

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

یعنی اپنے کسی عمل، کسی فعل اور کسی بات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ، اس کے علاوہ جو چاہے کرو۔ کیوں کہ ہماری شریعت میں اس کے سوا کوئی گناہ ہی نہیں۔

بس! یہی عرض کرنا ہے کہ آپ سختی سے اپنی زندگی کا یہ معمول بنالیں کہ آپ کے کسی کام سے کسی کو تکلیف اور اذیت نہ ہو۔ اگر آپ اس امر کا اہتمام کرلیں کہ ہر وہ کام چھوڑ دیں گے جس سے لوگوں کو تکلیف اور شکایت پیدا ہو تو انشاءاللہ آپ کے فیوض و برکات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔ اس سلسلے میں، اس مضمون میں مذکور، اس ضابطے کا پاس رکھنا اور پابندی ضروری ہے جو بیان کیا گیا ہے کہ اگر لوگوں کو کسی ایسے کام سے تکلیف اور تکدر ہو، جو شرعاً فرض و واجب ہے تو اُس کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا اور لوگوں کی شکایت کی طرف توجہ نہ کی جائے گی۔ لیکن اگر ہم کوئی مستحب یا مباح کام ایسے انداز سے کرتے ہیں کہ جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے تو اس کو دوسرں کی راحت کی خاطر ضرور چھوڑ دینا چاہیئے اور بلا وجہ ضد اور اصرار نہیں کرنا چاہیئے۔ کیوں کہ لوگوں کو تکلیف سے بچانا فرض ہے۔ اور جس کام کو ہم نے اپنی انا کا مسئلہ بنا رکھا ہے، وہ نہ فرض ہے نہ واجب۔ زیادہ سے مستحب یا مباح ہے تو ایسی صورت میں واجب اور فرض کو چھوڑ کر مستحب اور مباح کام کرنا، نہ ثواب کا باعث ہے اور نہ ہی جائز ہے۔ بلکہ گناہ ہے۔ اس لئے اس سے بچنا اور ایسے کاموں کا ترک کرنا ضروری ہے۔

وما علینا الا البلاغ

ACC No. 3080 Date
Section D/107 Status
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY
NAJAFI BOOK LIBRARY
Managed by Masoomeen Welfare Trust (R)
Shop No. 11, M. L. Heights,
Mirza Kaleej Baig Road,
Soldier Bazar, Karachi-74400, Pakistan.

دعوۃ اکیڈمی کے اغراض و مقاصد

- [illegible] تعلیمی، تربیتی اور تحقیقی پروگراموں کی منصوبہ بندی [illegible]
- [illegible] کے لیے تربیتی پروگرام [illegible] کرنا
- [illegible] کے لیے پروگرام [illegible] وضع کرنا
- [illegible] اسلامی لٹریچر کی تیاری اور اس کو [illegible] کے لیے مناسب منصوبہ بندی [illegible]
  [illegible] اہتمام کیا جائے گا
- [illegible] کے ساتھ [illegible] اور رابطہ
- [illegible] تک دعوت پہنچانا
- [illegible] اسلامی معلوماتی مرکز قائم کرنا
- [illegible]
  [illegible]
- [illegible] کے لیے ملاقاتی مرکز قائم کرنا

دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

پوسٹ بکس نمبر ۱۴۸۵، اسلام آباد۔ فون نمبر ۹- ۸۵۷۶۱۵، ۸۵۳۷۹۴